مزاحیہ کالم نگار: نصرت ظہیر

نصرت ظہیر اردو کے واحد ایسے طنزومزاح نگار ہیں جوموجودہ عہدمیں یونان کے ارسٹوفینز اور اینگلوآئرش جوناتھن سوفٹ کی روایت کی توسیع کررہے ہیں اور پولیٹکل سٹائر کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ ان کے سیاسی طنزیے ان کی قوت ادراک کا مکمل ثبوت ہیں۔

نصرت ظہیر کے سیاسی طنزیے پر گفتگو سے پہلے طنز کے آفاق اوراس کے متعلقہ اطراف پرنگاہ ڈالنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر نصرت ظہیر کے طنزومزاح کی معنویت منکشف نہیں ہوسکتی۔طنز Satire کا مترادف لفظ ہے جو لاطینی زبان Satura Lanx سے ماخوذ ہے۔لاطینی Satura کا معنی رنگین پھلوں کی طشتری ہے۔ یہ لفظ پہلے خالص ادبی معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن فوراً ہی اپنے اصل مفہوم کے دائرے سے نکل کر وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا کیوں کہ یہ لفظ اسم ہے اور بقول Robert Elliott جیسے ہی کوئی اسم، استعارہ کے Domain میں آتا ہے یا استعارہ کے طور پر استعمال ہونے لگتا ہے تو اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح Satire کے کئی پہلو وجود میں آگئے۔ مثلاً (۱) use of irony, (۲) A literary composition, in verse or prose (3) A literary genre وغیرہ۔

قدیم انگریزی لفظ Satire کا تعلق لاطینی زبان کے Satura سے تھا لیکن "Satirize" اور "Satiric" وغیرہ Greek زبان کے الفاظ ہیں۔ چوتھی صدی کے قریب Satire کے مصنف کو Satyricus کہا جاتا تھا۔مثلاً اسی صدی میں St.Jerom کے حریفوں میں سے ایک انہیں Satyricus Scriptor in Prosa(A Satirist in Prose) کہتا تھا۔بعدازاں لاطینی sature علم ہجہ میں ترمیم ہوکر Satire بن گیا۔اس جدید لفظ satire کا استعمال کئی forms میں ہونے لگا۔مثلاً ڈرامائی، میڈیائی اورنثریاتی وغیرہ۔Satire کا استعمال رفتہ رفتہ کئی مقاصد کے لئے بھی ہونے لگا، مثلاً ایتھنز میں سیاسی رائے عامہ بحال کرنے میں سیاسی طنزنگار Aristophanes کی شاعری اورڈراموں نے غیر معمولی رول ادا کیا۔

طنز کے ابتدائی نمونے قدیم 2nd Millennium BC میں مصر میں ملتے ہیں جس کا استعمال ان طالب علموں کے لئے کیا جاتا تھا جو پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تھے۔ Papyrus Anastasis 1 اس وقت کا مشہور طنزنگار تھا۔

مشرق وسطی میں عربی اور فارسی کے طنزنگار بہت مشہور تھے۔عربی شاعری میں طنز کو ہجو کہا جاتا تھا۔نویں صدی میں الجاحظ نے عربی نثر میں طنزیہ اسلوب

ایجاد کیا تھا۔ان کے طنز کے موضوعات سماجیات ، بشریات اورنفسیات وغیرہ تھے۔ارسطو کی شعریات کو جب عربی میں ترجمہ کیا گیا تو عربی کے طنز کو Comedy اور Satire کے مترادف تسلیم کر لیا گیا۔ چودھویں صدی میں عبید زاکانی نے طنز کو فارسی میں متعارف کیا۔اس کے طنز زیادہ تر سیاسی اور Homosexuality سے تعلق رکھتے تھے۔

The Elizabethan دور میں طنز عام طور پر Pamphlet form میں ہوتا تھا جس میں نثریت کے بجائے سیدھی گالی ہوتی تھی۔لیکن فرنچ مصنف Huguenot Issac Casaubon نے 1605 میں طنز کو پہلے سے زیادہ مہذب تصور کیا اور civilised اسلوب میں پیش کیا۔اینگلو آئیرش مصنّفین میں Jonathan Swift پہلا شخص تھا جس نے جدید Journalistic satire لکھنا شروع کیا۔

The Sot Weed Factor کے مصنف Ebenzer Cooke ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے برطانوی نوآبادیات میں طنز کو متعارف کرایا۔اس کے ہم عصر طنز نگاروں کے طنز کا استعمال ملک کے ظہور پذیر تہذیب کو بہتر صورت میں ڈھالنے کے لئے اور اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔وکٹوریائی دور میں طنزیہ ناول نگار Charles Dickens وغیرہ نے اپنے طنزیہ عبارتوں کے ذریعہ سماجی مسئلوں کو پیش کیا۔

بیسویں صدی میں جارج آرویل اورالڈوس ہکسے جیسے مشہور مصنفوں نے طنز کا استعمال یوروپ اور امریکہ میں خطرناک اور خاموشی سے ہونے والی سماجی تبدیلی پر تشویش ناک اور ڈراؤنی نشریات پر کیا۔Joseph Heller کی مشہور تخلیق Catch-22, Satirize bureaucracy اس دور کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔Sinclair Lewis کی کہانیاں ہم عصر امریکی قدروں پر گہرا طنز کرتی ہیں۔

مزاح ،ظرافت ،طنز ،ہجو اور پیروڈی کی روایت بہت قدیم ہے۔عربی ، فارسی اور انگریزی ادب کے وسیلے سے اردو ادب میں آئی۔اردو شاعری کے ابتدائی دور سے آج تک اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے واعظ و ناصح اور اس طرح کے دوسرے افراد کو طنز و مزاح کا نشانہ نہ بنایا ہو لیکن اس کا باقاعدہ آغاز سترھویں صدی میں عہد عالمگیری کے ایک بے باک اور بے لگام شاعر اور ہجو نگار جعفر زٹلی کے ہاتھوں ہوا ہے اس نے ہر خاص و عام کو اپنے طنز وتضحیک کا نشانہ بنایا لیکن زٹلی کی ہجویہ شاعری میں عامیانہ پن ، پھکڑ پن اور ابتذال کی زیادتی حد سے زیادہ ہے لہٰذا ان کی طنزیہ شاعری کی اہمیت کم تر ہوگئی ہے۔جعفر زٹلی کے بعد سودا بہ حیثیت ظرافت نگار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔سوداؔ کی ظرافت نگاری کا بڑا حصہ ان کی ہجویہ شاعری میں نمایاں ہے۔ہجو نگاری اس عہد کی سماجی ناانصافیوں اور بے اعتدالیوں کے ردِّعمل کا نتیجہ ہے لیکن اس سے اصلاحی مقصد پورا نہیں ہوتا کیوں کہ ہجویہ شاعری میں ہمدردی وغمخواری کے بجائے حقارت ونفرت زیادہ ہوتی ہے۔سوداؔ کے بعد انشاء کی شاعری میں بھی ظرافت بہت پائی جاتی ہے۔قدیم شعراء میں غالبؔ اور نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی طنز و مزاح کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔غالبؔ کے مقابلے میں نظیرؔ کی شاعری میں طنز کم ہے لیکن ظرافت و مزاح زیادہ ہے۔غالبؔ کی شاعری میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنزیہ شاعری کے نادر اور لطیف نمونے پائے جاتے ہیں پھر بھی غالبؔ کو طنز و مزاح کا شاعر ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری میں طنز و مزاح کی حیثیت جزوی ہے۔اردو شاعری کی تاریخ میں اکبرؔ سے بڑا حیوانِ ظریف آج تک پیدا نہیں ہوسکا۔اکبر کے مزاج کو طنز و مزاح سے ایک خاص مناسبت تھی۔اتفاق سے انھیں طنزیہ شاعری کے لیے سازگار ماحول بھی ملا۔اکبرؔ کی طنزیہ شاعری سے اقبالؔ جیسا عظیم مفکر اور قادر الکلام شاعر بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کیونکہ شاعری کی مدد سے سماج کی بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا اور قوم کی اصلاح کرنا آسان کام ہے۔اکبرؔ کے بعد سے آج تک متعدد شاعروں نے اکبرؔ کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کو بھی اکبرؔ جیسا بلند مرتبہ نہیں ملا۔ویسے اکبرؔ کے بعد طنز و مزاح کے شاعروں میں ظریفؔ لکھنوی ، بوؔم میرٹھی ، شوقؔ بہرائچوی ، احمقؔ پھپھوندوی ، فرقتؔ کاکوروی ، ظریفؔ دہلوی ، راجہ مہدی علی خان سے لے کر شیخ نذیر ، ضمیر جعفری ، مجید لاہوری ، واہی سید محمد جعفری ، دلاور فگار اور شہبازؔ امروہوی وغیرہ بھی شامل ہیں۔اودھ پنچ میں لکھنے والے مزاحیہ طنزیہ نثر نگاروں میں منشی سجاد حسین ، احمد علی شوق ، سید محمد آزاد ، رتن ناتھ سرشار ، تربھون ناتھ ہجر ، جوالا پرشاد برق ، عبدالغفور شہباز ، مچھو بیگ ستم ظریف ، احمد علی کسمنڈوی ، محفوظ علی بدایونی اور امید علی امیٹھوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔طنز و مزاح کا استعمال شاعری اور ادبی نثر کے علاوہ صحافتی نثر و نظم میں بھی کیا گیا اور ادبی

رسالوں، ہفت روزہ پرچوں اور روزناموں میں فکاہیہ کالم لکھے گئے جو بے حد مشہور ہوئے۔ ان فکاہیہ نگاروں میں ریاض خیر آبادی، سندباد جہازی، حاجی لق لق، مجید لاہوری، سالک بٹالوی، شاہد صدیقی وغیرہ خاص تھے۔ آزادی کے پیشتر طنز و مزاح نگاروں کی ایک جماعت جن کے یہاں مزاح کے مقابلے میں طنز کا عنصر زیادہ تھا ایسے مصنفوں میں فرحت اللہ بیگ، سجّاد انصاری، سلطان حیدر جوش، ظفر علی خان، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایک دوسری جماعت جو محض تفریح کے لئے مزاحیہ نثر لکھتی تھی ان میں ملّا رموزی، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج، شفیق الرحمٰن اور پطرس بخاری وغیرہ خاص تھے۔ ان طنز و مزاح نگاروں میں فکر تونسوی، دلیپ سنگھ، مولانا ابوالکلام آزاد اس اعتبار سے مختلف تھے کہ ان کے یہاں خالص طنز ہے۔

آزادی کے بعد کے نثری طنز و مزاح نگاروں میں ظ انصاری، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مشفق خواجہ اور تخلص بھوپالی، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی، وجاہت علی سندیلوی، بھارت چند کھنّہ، مجتبیٰ حسین اور خواجہ عبدالغفور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں ہر ایک کی اپنی الگ حیثیت اور جداگانہ مقام ہے۔ موجودہ دور میں اردو نظم و نثر کے طنز و مزاح نگاروں میں ساغر خیامی، انور سدید، خالد اختر، نریندر لوتھر، رحمٰن اکولوی، شکیل اعجاز، پرویز یداللہ مہدی، عظیم اختر، اسد رضا اور نصرت ظہیر وغیرہ کے یہاں اس فن کے روشن امکانات ہیں۔

طنز سے زیادہ Enlighted کرنے، گدگدانے یا پھر غصّہ دلانے والی چیز شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں برس پرانی ہونے کے بعد بھی طنز کے تاب و توانائی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ طنز و مزاح نگار، اس فن کا استعمال عام طور پر سماج میں ایک خاص قدر (Value) پیدا کرنے کے لئے کرتا ہے یا محض مزاح پیدا کرنے کے لئے بھی کرسکتا ہے۔ زندگی کی مضحک کیفیت یا ظاہری روئداد کا معائنہ یا مشاہدہ کرکے اس کا مذاق اڑانا ''مزاح'' ہے۔ صنف مزاح اپنے محدود دائرہ یعنی وقتی خوش طبعی اور بے ضرر دل لگی سے باہر نکلتی ہے اور اس کی تہ میں زندگی اور اس کے متعلقات کی مضحک اور ناہموار صورتوں سے دل آزاری، نفریں اور برہمی کا اظہار ہو تو اسے طنز کہتے ہیں۔ زندگی کی بیشتر ناہمواریاں اور کمزوریاں ایک عام انسان کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں لیکن ایک حساس طبع اور دور بیں ادیب ان ناہمواریوں اور کمزوریوں کو بے حد قریب سے دیکھتا ہے اور پھر اپنے فقروں سے ان کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے کہ اس کا مذاق تخلیقی پیرایہ اختیار کرلیتا ہے۔ مزاح کی خوبی یہ ہے کہ اس سے کسی کی تضحیک، دل شکنی یا تعریض نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو جس کا مذاق اڑایا جاتا ہے وہ اس مذاق سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ طنز میں اصلاحی مقصد بھی پوشیدہ رہتی ہے۔ طنز کی خوبی یہ بھی ہے کہ جس شخص کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہ بظاہر ہنستا ہے لیکن اندر ہی اندر خجالت محسوس کرتا ہے۔ طنز میں اس قدر میٹھی نشتریت ہوتی ہے کہ سننے والے کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ آہ بھی نہیں کرتا بلکہ مسکراتا رہتا ہے۔ طنز کو مزاح پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ مزاح کے مقابلے میں طنز کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مزاح وقتی خوشی و مسرت دیتا ہے لیکن طنز خوشی و مسرت کے ساتھ ساتھ حالات کو بدل دینے کی ترغیب دیتا ہے۔

موجودہ دور میں نصرت ظہیر اپنے ہمعصروں سے اس لئے مختلف ہیں کہ ان کے یہاں سیاسی طنز سب سے زیادہ ہے۔ ویسے ان کے کالم میں سماجی اور اخلاقی قدروں پر بھی طنز ملتا ہے لیکن وہ سیاسی طنزیہ کالم نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہورہے ہیں کیوں کہ ان کے سیاسی کالم قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے طنز و مزاح نگار ہیں جو ہمارے سماج میں ہونے والے واقعات و حادثات کے تمام پہلوؤں کو ایک خاص Aesthetic Distance سے دیکھتے ہیں اور ان میں چھپے منفی پہلوؤں کو طنز و مزاح کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی تحریروں سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور سماجی، سیاسی و معاشی ناہمواریوں، کمزوریوں، برائیوں اور شاطرانہ چالوں سے باخبر بھی۔

نشتریت طنز کا جوہر ہے۔ نشتریت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، لفظی نشتریت اور واقعاتی نشتریت۔ جب کچھ کہا جائے لیکن وہ بے معنی ہو تو اسے لفظی نشتریت کہتے ہیں لیکن جب کوئی واقعہ یا Situation پیدا ہو لیکن Logical نہیں ہو تو اسے واقعاتی یا Situational نشتریت کہتے ہیں نشتریت ہی دراصل طنز میں مزاحیہ عناصر پیدا کرتی ہے۔ نصرت ظہیر کے مضامین میں نشتریت کی یہ دونوں شکلیں پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے جملوں، فقروں اور لفظوں کے برمحل استعمال سے بھی بلا کا طنز و مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طنز و مزاح کے حسن کو وہ برہنہ کرکے نہیں دیکھاتے ہیں بلکہ

روزن سے دکھاتے ہیں جس سے طنز ومزاح کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے جبکہ بعض مزاح نگار طنز ومزاح کے جسم سے کپڑے اتار دیتے ہیں لیکن نصرت ظہیر آہستہ آہستہ دبیز تہوں کو اتارتے ہیں کچھ اس طرح کہ قاری کا تجسس قائم رہتا ہے اور قاری آگے کی عبارت پڑھنے کے لئے بے قرار ہوجاتا ہے۔ مثلاً راشٹریہ سہارا میں شائع مضمون ''یہ ووٹ کس کو دوں؟'' میں انہوں نے لفظ 'عوام' کا اپنے لئے صیغہ واحد میں غلط استعمال کرنے کے بعد اس کو justify کرنے کے لئے یہ لکھا ''جمہوریت میں لوگ جیتے جاگتے عوام کو ہی غلط استعمال کرجاتے ہیں''۔ اس جملے کو پڑھنے کے بعد قاری کی حسِ مزاح بیدار ہوتی ہی ہے کہ اس جملے پر پہنچتا ہے ''اکثر عوام کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کوئی انہیں استعمال کر گیا''۔ یہاں پہنچ کر قاری پوری طرح مزاح سے محظوظ ہونے لگتا ہے۔ لیکن پہلے کوٹ کئے ہوئے جملے سے دوسرے کوٹ کئے ہوئے جملے تک پہنچنے میں جو وقت لگتا ہے اس سے قاری کی بے چینی بڑھتی ہے کیوں کہ ان کا خاص اندازِ بیان قاری کو فوراً محظوظ نہیں ہونے دیتا جبکہ قاری فوراً لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

اپنے مقبول کالم 'نمی دانم' کے ایک مضمون 'جوتوں کا عالمی بھائی چارہ' (19 اپریل 2009) میں چاروں طرف ملک و بیرونِ ملک میں بڑے بڑے لیڈروں پر جوتے، چپل اور کھڑاؤں چلا کر عوام اپنی ناراضگی اور لیڈروں کے تئیں بیزاری کا اظہار کررہے ہیں وہیں نصرت ظہیر نے جوتوں، چپلوں اور کھڑاؤں کے درمیان عالمی بھائی چارہ قائم ہوجانے کی بات کہہ کر نہ صرف مزاح پیدا کیا ہے بلکہ عوام کو بھی ان جوتوں اور چپلوں سے سبق سیکھنے کی ترغیب دے ڈالی ہے جس میں غیر متحد سماج پر بہت بڑا طنز بھی ہے۔ نصرت ظہیر نے جوتے چپل کی واردات کو امریکی افسانہ جو فنٹاسی سے بھرپور ہے سے جوڑ کر اس پورے مسئلے کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس سنجیدگی میں طنز ومزاح کی بے شمار لہریں موجود ہیں جو بُش کی شخصیت پر طنز کا وار کرتی ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اس کہانی پر اگرچہ کسی صحیح العقل آدمی کو یقین نہیں آئے گا، لیکن مجھے نہ جانے کیوں یقین ہوچلا کہ کاروں کی طرح جوتوں میں بھی ایک خاموش عالم گیر اتحاد قائم ہوچکا ہے اور وہ کسی ایک بوڑھے کے نہیں، بلکہ بہت سے بزرگوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ جوتا برادری کے کسی لیڈر نے کال دے دی ہو کہ ''دنیا بھر کے جوتو، ایک ہوجاؤ'' اور ہوسکتا ہے جوتوں کی اس انسان دشمنی کی وجہ یہ ہو کہ بش کے انتظامیہ نے اُن جوتوں کو جلا کر راکھ کردیا تھا، جو منتظر زیدی نے ان پر پھینک کر مارا تھا۔ ایک مجاہد اور غازی جوتے کے ساتھ اس سلوک نے یقیناً جوتا برادری کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہوگی''۔ نصرت ظہیر کے ان جملوں میں بُش کو اس بڈھے سے تعبیر کیا گیا ہے جس نے امریکی کہانی میں کار کو نقصان پہونچایا تھا جس سے بعد میں تمام گاڑیوں نے اس کی ہڈی پسلی توڑ کر ایک پہاڑی پر تنہا زندگی گذارنے کے لئے مجبور کردیا تھا۔ اسی طرح منتظر زیدی کے جوتے متحد طاقت کی علامت ہیں جو ایسے تمام ظالم لیڈروں کو نیست ونابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ نصرت ظہیر کے ایک کالم ''جوتے کی جمالیات'' میں بُش تمام ظالم سیاست دانوں کی جبکہ جوتے سماج کے دبے کچلے لوگوں کی علامت ہے۔ 26 اپریل کے کالم میں لکھتے ہیں ''میرا ادب سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو سب سے زیادہ بے ادب سمجھا جاتا ہے۔ آخر جوتا ہوں۔ پسماندہ غریب، دلت اور شیڈولڈ کاسٹ مخلوق کی طرح'' لیکن اب یہ قوم متحد ہوگئی ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کے لئے ہر فرد فوراً آگے آرہا ہے۔ میڈیا والے بھی ان کی طاقت کو محسوس کرکے انہیں ترجیح دے رہے ہیں۔ اس لئے سیاست دانوں کے کان کھڑے ہوگئے ہیں اور اپنے بچاؤ کے لئے ہر ممکن کوشش کررہے ہیں۔ نصرت ظہیر نے ''جوتے کی جمالیات'' میں نریندر مودی کو کس طرح اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے قابلِ تعریف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میری برادری کا تو طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کے یہاں ترسیل فوراً ہوتی ہے۔ خود جوتا آپ کے سر تک پہنچے نہ پہنچے اس کی بات ضرور سب تک پہنچ جاتی ہے... اب نریندر مودی کو ہی دیکھ لو۔ میں ابھی اُس تک نہیں پہنچ پایا ہوں، لیکن میری خبریں پہنچ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ اب وہ صرف اُسی اسٹیج سے تقریر کرتا ہے، جس پر جوتوں سے بچنے کا جال لگا ہوا ہو۔ آہ! بے چارے کے اعصاب پہ جوتا ہے سوار۔'' نصرت ظہیر نے طنز ومزاح کے پیرائے میں جس طرح سیاستدانوں کے اعصاب پر جوتے سوار کردیئے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں۔ نصرت ظہیر نے اڈوانی اور مودی جیسے لیڈروں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے کیوں کہ جوتے ان پر بھی چلے ہیں اور جوتوں سے یہ بھی خوف زدہ ہیں۔ جوتے چلنے والے واقعات وواردات کا

فائدہ اٹھاتے ہوئے نام نہاد ''لوہ پُرش'' کہلانے والے اڈوانی کی پوری شخصیت کو یہ کہہ کر غارت کر دیا ہے کہ ''اسپورٹ شو کی تقلید میں دوسری طرح کے جوتے اور چپّل کے بعد کھڑاؤں تک آگے آ گئی ہے، جو اڈوانی صاحب کے سر کو نشانہ بنا کر ایک طرح سے خودکش حملے پر بھیجی گئی تھی۔ خودکش یوں کہ خدانخواستہ وہ اڈوانی صاحب کے سرِ عزیز سے ٹکرا جاتی تو سر کا تو کچھ نہ بگڑتا مگر کھڑاؤں یقیناً پاش پاش ہو جاتی۔ ظاہر ہے کھڑاؤں عام طور پر لکڑی سے بنتی ہے، جب کہ جناب اڈوانی ہماری قوم کے لوہ پُرش، یعنی مردِ آہن ہیں اور لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ چوب و آہن کا بھلا کیا مقابلہ؟''

اسی طرح 3 مئی 2009 راشٹر یہ سہارا میں نصرت ظہیر کا مضمون ''ایک اور پی ایم اِن ویٹنگ'' کا عنوان بھی قاری کے تجسس کو بڑھا دیتا ہے کہ پی ایم کے لئے جن ناموں کو اخباروں میں اچھالا جا رہا ہے ان کے علاوہ ایک اور کون سا نام ہے جو نصرت ظہیر کی نگاہ میں ویٹنگ میں ہے۔ کیوں کہ ایک مزاح نگار جب پی ایم اِن ویٹنگ کی بات کرتا ہے تو وہ کوئی معمولی نام نہیں ہوگا بلکہ غیر معمولی نام ہوگا وہ بھی ایسے حالات میں جب جوتے اس قدر مشہور اور طاقتور ہو چکے ہوں اور پی ایم کے ناموں کے اُچھالے جانے کے ساتھ ساتھ جوتے بھی اُچھالے جانے کا بازار گرم ہو۔ لہٰذا قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ کہیں ''پی ایم اِن ویٹنگ'' جوتا ہی تو نہیں ہے۔ آخر میں جب نصرت ظہیر پی ایم کے لئے جوتے کا نام پیش کرتے ہیں تو قاری اس سے اور محظوظ ہوتا ہے کیوں کہ قاری کو بھی یہی امید تھی ساتھ ہی طنز و مزاح کا یہ نقطۂ عروج ہے۔ دراصل نصرت ظہیر نے لفظ ''اچھالنے'' سے بڑا کام لیا ہے اور پی ایم کے نام اور جوتے کے اچھالے جانے میں مناسبت پیدا کر کے عجیب و غریب مزاح کے ساتھ طنز پیدا کر کے پی ایم کی پوسٹ کو غارت کر دیا ہے اور یہ کہہ کر:

''یقین کرو...اس ملک کو نہ پنجے کی ضرورت ہے نہ کمل کی، نہ ہاتھی کی نہ سائیکل کی، نہ ہنسیا کی نہ ہتھوڑے کی...ملک میں اتنے مسائل، اتنی الجھنیں، اتنی افراتفری اور اتنی بے راہ روی ہے کہ اسے کوئی جوتا ہی ٹھیک طرح سے چلا سکتا ہے...''

جوتا اپنی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ ایک جوتا اس کے منھ پر کھینچ ماروں۔ آخر ایک جوتا ہی جوتے کے گھمنڈ کو توڑ سکتا تھا!۔''

ان جملوں میں ظہیر نے تمام سیاسی پارٹیوں پر طنز کیا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان کے مسائل لاعلاج ہیں۔

نصرت ظہیر نے لال کرشن اڈوانی اور مودی جیسے لیڈروں کے جذبۂ خدمتِ عوام الناس سے عجیب و غریب طنز پیدا کیا ہے۔ انہوں نے لیڈروں کے خدمتِ عوام الناس کے اس جذبے کے مفہوم کو بالکل بدل دیا ہے اور اس ایک لفظ میں ظلم و ستم کی پوری داستان رقم کر دی ہے۔ خاص کر یہ فقرہ لکھ کر ''ابھی تک تو جو ہوا وہ صرف ٹریلر تھا'' فسادات کے تمام خوفناک منظر کو پیش کر دیا ہے اور آگے ہونے والے خطرات سے بھی قاری کو آگاہ کر دیا ہے۔

نصرت ظہیر نے ایک جگہ اور یہ لکھ کر ''پھر میرے ساتھ تو ایک اور مصیبت ہے اور وہ یہ کہ کہنے کو تو میں خالص عوام ہوں، مگر ہوں ذرا خاص قسم کا۔ اور خاص قسم کا یہ کہ میں جب بھی جسے بھی ووٹ دیتا ہوں، وہی ہار جاتا ہے۔'' غیر متحد مسلم قوم پر طنز بھی کیا ہے اور اسے متحد ہونے کی ترغیب بھی دے دی ہے۔

نصرت ظہیر نے بعض الفاظ، فقرے اور جملوں کے برمحل استعمال سے بھی طنز و مزاح میں عجیب و غریب کیفیت پیدا کی ہے۔ مثلاً چُناوی ہنگاموں کے لئے اُچھل کود، دھمال، چوکڑی اور ہڑبونگ وغیرہ۔ اسی طرح ان کے یہ جملے ''آپ ہمیں خدمت سے نہیں روک سکتے۔ یہ ہمارا پیدائشی اور آئینی حق ہے'' اور ''سب کے سب ہماری خدمت کے لئے اتنے ہی پریشان ہیں، ورنہ آرام سے بیچارے گھر بیٹھ کر بیوی اور ٹی وی نہ دیکھتے'' جیسے جملے لاجواب ہیں۔ ان

میں بلا کا طنز و مزاح چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے ایک کالم ''عدلیہ کا عمل دخل'' میں لفظوں کے استعمال سے بلا کا مزاح پیدا کیا ہے۔ مثلاً وکیلوں کی جیب کی جگہ دوزخ، پیسوں کی جگہ ایندھن کا استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ ہم قافیہ عدالتی الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کیا ہے۔ مثلاً یہ جملے دیکھئے: ''عدلیہ کے اختیارات، زندگی کے مشکلات اور انسانی مسئلوں کے حل کے امکانات پر تبادلۂ خیالات کی شروعات کی تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز بیان میں'' اسی طرح انہوں نے نقلی وکیل صاحب کے مخصوص تکیہ کلام اور املے کی اغلاط سے مزاحیہ پیرائے میں عدلیہ اور وکیلوں کا مذاق اُڑایا ہے۔ مثلاً برخوردار کی جگہ خر بردار، سپریم کورٹ کی جگہ پکریم سورٹ، سکریم پورٹ، رت پیٹیشن کی جگہ پٹ پیٹیشن، ماحولیاتی آلودگی کی جگہ لاحولیاتی مالودگی، عدلیہ کی عمل دخل کی جگہ عدلیہ کی عمل وخلل، عملیہ کا خلل، ادل بدل، غلط ملط وغیرہ۔

نصرت ظہیر اپنے آس پاس کے ماحول اور ہر خاص و عام پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے درمیان ہونے والے مکالموں کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور اپنے کالم میں انہیں طنز و مزاح کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ 10 مئی 2009 کو شائع کالم ''مئی کی گرمی سیاست کی سرگرمی'' میں الیکشن کے چوتھے مرحلے کے ختم ہونے کے بعد ہر خاص و عام چاہے وہ سبزی فروش یا گوشت فروش یا نائی کو سیاست اور سیاسی جوڑ توڑ کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ مثلاً لالو پرشاد یادو کے کانگریس پارٹی سے رشتہ خراب ہونے اور بہار میں امید سے کم سیٹیں حاصل کرنے کے فرسٹریشن کا اثر اخباری نامہ نگاروں پر غصّہ اتارنے کی صورت میں دیکھا گیا تھا۔ نصرت ظہیر نے اس پورے واقعہ کو طنز و مزاح کی شکل میں پیش کرنے کے لئے لالو کا ہم قافیہ سبزی آلو کی گھٹتی بڑھتی قیمتوں کی تشبیہہ لالو جی کے بدلتے ہوئے بیانات سے دے کر ان کا مذاق اُڑایا کیوں کہ جس طرح آلو کی قیمت اور ممبئی کے سنسکس کے اترنے اور چڑھنے کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اسی طرح لالو کے سیاسی قول فعل کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ نصرت ظہیر آلو فروش کے مکالمے کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''میرے باپ کے زمانے میں آلو ڈھائی روپے من تھا اور ایک مہینہ پہلے تک لالو پرساد سونیا اور راہل کا گن گان کرتے نہیں تھکتے تھے۔ آج آلو کا بھاؤ اور لالو کا سو بھاؤ دیکھ لیجئے کہ جو شخص لوگوں کو بات بات پر ہنسا دیتا تھا، آج ذرا ذرا سی بات پر خود تاؤ کھا جاتا ہے! 16 مئی کے بعد دیکھ لینا کہاں تو پردھان منتری بننے کے سپنے دیکھ رہے تھے، اب کے کانگریس پھر حکومت میں آ گئی تو منتری منڈل میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

نصرت ظہیر نے ان خیالات کا اظہار لالو کے لئے کیا ہے لیکن اس کا اطلاق تمام لیڈروں پر ہوتا ہے کیوں کہ کم و بیش یہی حال تمام سیاسی پارٹیوں کا ہے۔ الیکشن سے پہلے کچھ کہتے ہیں اور الیکشن کے بعد کچھ اور کہنے لگتے ہیں۔ نصرت ظہیر نے سیاسی رہنماؤں کے بدلتے ہوئے رنگ کو سبزیوں کی گھٹتی بڑھتی قیمتوں سے اس لئے مشابہ قرار دیا کہ آج کل کے رہنماؤں کی قیمت سبزیوں کی قیمت سے زیادہ نہیں ہے۔ دوکوڑی کی سیاست پر تنقید و گفتگو کرنے کے لئے سبزی فروش، گوشت فروش اور نائی ہی کافی ہیں۔ اس لئے نصرت ظہیر نے باربروں کی مناسبت سے اس کی چلتی ہوئی قینچیوں کی تشبیہ سیاست دانوں کی چرب زبانی سے دے کر نیتاؤں پر کس خوبصورتی اور Perfection کے ساتھ مزاح کے پیرائے میں طنز کیا ہے۔ سیلون کے اندر کی منظر کشی ذرا ملاحظہ کیجئے:

> ''آئینے کے سامنے کرسیوں میں بندھے ہوئے عوام کے سروں پر باربروں کی قینچیاں لیڈروں کی زبان کی طرح کتر کتر چل رہی تھیں۔''

نیتاؤں پر طنز کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ مثلاً ورون گاندھی کا حالیہ بیان جس میں اس نے کسی خاص فرقے کے ہاتھ کاٹنے کی بات کی تھی جس کی تمام لوگوں نے مذمت کی تھی۔ اسی بیان کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے نصرت ظہیر نے اسی کالم میں ایک قصائی کے ذریعہ یہ سوال قائم کیا کہ کیا ورون کو قصائیوں کا کام آتا ہے؟ پھر کورٹ میں اس کے دیئے گئے حلفیہ بیان کے متعلق یہ سوال کہ کیا اب اسے ویجیٹیرین سیاست کرنے کا ارادہ

ہے، انتہائی معنی خیز ہے۔ ذرا یہ گفتگو بھی ملاحظہ کیجئے:

’’ویسے یہ تو بتایئے ورون گاندھی کس قوم کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی بات کر رہا تھا...کیا اسے قصائیوں کا کام آتا ہے؟...اور اب جو اس نے عدالت کو حلفیہ بیان دے دیا ہے کہ آئندہ کبھی کسی کا ہاتھ پاؤں کاٹنے جیسی باتیں نہیں کرے گا تو کیا اب اس کا صرف وَیجیٹیرین سیاست کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘

ان جملوں میں بلا کا طنز ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آج کل گاندھی وادی سیاست ناپید ہوگئی ہے۔

نصرت ظہیر نے 4 جنوری 2009 کو شائع اپنے کالم ’’گیا سال، نیا سال!‘‘ میں اس بات کی طرف قاری کو متوجہ کیا ہے کہ کوئی بھی سال نہ اچھا ہوتا ہے اور نہ برا۔ انسان اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے گذرے ہوئے سال کو ذمہ دار مانتا ہے۔ اسی لئے پرانے سال کو لعنت ملامت کرتا ہے اور آنے والے نئے سال کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن اس سال کے خاتمے پر اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتا ہے جو اس سے پہلے والے سال میں کر چکا تھا۔ یہ سلسلہ سالہا سال چلتا رہتا ہے۔ اسی لئے نصرت ظہیر نے سماج کے اس غلط رواج پر طنز کیا ہے کیوں کہ کسی خاص سال میں جو اچھے یا برے واقعات و حادثات ہوتے رہتے ہیں اس سے رواں سال کا کوئی لینا دینا نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا سال کے گزرنے یا نئے سال کی آمد سے ماتم یا خوشی منانے کا کوئی صحیح جواز نہیں۔ انہیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نصرت ظہیر نے دہلی میں ہونے والے قتل و غارت گری، عصمت دری کی تفصیل پیش کرتے ہوئے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں سوال اٹھایا ہے کہ کیا ان سب کا ذمہ دار گزرا ہوا سال ہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’دہلی میں پانچ سو سے زیادہ قتل ہوئے تو گویا وہ 2008 نے انجام دیئے، اس سے بھی زیادہ لوگ سڑک حادثوں میں مرے تو موٹر گاڑیوں اور بلولائن بسوں کی ڈرائیونگ سیٹ پر شاید 2008 بیٹھا ہوا تھا، سیکڑوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی تو اس کے لئے 2008 کو سنگسار کر دینا چاہئے، میں یہ نہیں کہتا کہ ہم ہر بری بات کے لئے گزرے ہوئے سال کو سیدھے طور پر ذمہ دار قرار دیتے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم کسی بھی سال کے محاسبے کو آدم زاد کا محاسبہ بنا کر سامنے نہیں رکھتے، اسے خود سے الگ رکھ کر کچھ اس انداز سے سامنے لاتے ہیں، جیسے ہم تو بیچ میں ہیں ہی نہیں۔‘‘

اگر کسی متن کے اصل اسلوب سے جارحانہ پن کا اظہار ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف سماج کے کسی نامعقول عقیدے کی طرف طنز کے ذریعہ قاری کو متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ نئے سال کے متعلق لوگوں کا یہ عقیدہ کہ گذرا ہوا سال منحوس ہے، یقیناً نامعقول ہے۔

نصرت ظہیر نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور مختلف علوم و فنون میں اصل جوہر کی عدم موجودگی کی طرف بھی طنزیہ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے سال 2009 میں بہتری کی امید ظاہر کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

’’دوستو جی چاہتا ہے کہ نئے سال سے کچھ نئی امیدیں قائم کرلوں، مثلاً یہ امید کہ اس سال آدمی بالآخر حیوانی حرکتوں سے بور ہو کر انسان بننے پر مجبور ہو جائے گا، اردو کے ادیب نثر کی طرف زیادہ توجہ دینے لگیں گے، پورے سال کوئی نیا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوگا، مشاعروں میں ترنم سے شعر پڑھنے پر پابندی لگ جائے گی، شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے بعد شاعری سے بھی باز آئیں گے! شاہ رخ خان تھوڑی سی اداکاری سیکھ لے گا، نئے فلمی گلوکاروں کے لئے سُر میں گانا لازمی ہو جائے گا، ہیروئینوں سے کہا

جائے گا بی بی کبھی کبھار سین میں تھوڑے سے کپڑے بھی پہن لیا کرو اور پھر بھی باز نہ آئیں تو سنسر بورڈ ان کے لئے کم سے کم کپڑے پہننے کی بلحاظِ عمر زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دے گا۔''

اس عبارت کے پہلے جملے یعنی ''اس سال آدمی بالآخر حیوانی حرکتوں سے بور ہو کر انسان بننے پر مجبور ہو جائے گا'' میں لفظ 'بور' سے نصرت ظہیر نے عجیب وغریب طنز ومزاح کی کیفیت پیدا کی ہے۔اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سماج میں حیوانگی کس قدر بڑھی ہوئی ہے۔اس حیوانگی کو دور کرنے کے لئے نہ پولس کارگر ہو سکتی ہے اور نہ کسی ناصح کی نصیحت۔ یہ تبھی ختم ہوگی جب درندگی سے درندے بور ہو جائیں گے۔ظہیر نے وزن و بحر سے مبرّا اور یکسانیت کی شکار اردو شاعری، مشاعروں کے بے سرے شاعروں اور فلمی ہیروئینوں کے ننگا پن پر بھی مزاح کے پیرائے میں طنز کیا ہے۔

22 فروری 2009 کو شائع کالم ''عدلیہ کا عمل دخل'' میں نصرت ظہیر نے عدلیہ، وکیلوں، سرکاری محکموں، کرمچاریوں، پولس والوں اور خاص کر سیاست دانوں پر طنز کیا ہے تا کہ عوام بیدار ہو جائیں اور غلط اور صحیح کی پہچان کر کے زندگی کے ہر موڑ پر مناسب قدم اٹھائیں۔اس کالم میں انہوں نے وکیلوں کا مذاق اڑانے کے لئے ایک ایسے شخص کو وکیل بنا کر پیش کیا ہے جس کی وکالت کے غبارہ سے ہوا یہ کہہ کر نکال دی ہے کہ وہ خط وکتابت کے ذریعے وکالت کیا کرتا تھا:

''جوانی کے کسی دورِ علالت میں وکالت بھی بذریعہ خط وکتابت کر چکے تھے۔ گو وکالت کے بعد وہ عدالت سے حتی الامکان دور اور شہر کے بہت سے موکل ان سے محفوظ رہے، لیکن قانونی مشورے ہر کسی کو دیتے رہتے تھے اور وہ بھی مفت! بس ایک تازہ غزل برداشت کرنی پڑتی تھی۔''

نصرت ظہیر نے جس وکیل کی تصویر پیش کی ہے اس سے یہ قول سچ معلوم ہوتا ہے کہ 'ہندوستان کا ہر شخص ڈاکٹر اور وکیل ہے'۔متذکرہ جملوں میں ان بے تکے شاعروں پر بھی طنز کیا ہے جنہیں اپنی غزلیں سنانے کی بیماری ہوتی ہے۔

اس کالم میں سیاست دانوں کی اس سوچ پر بھی طنز کیا گیا ہے جس کی بدولت وہ کہتے ہیں عدلیہ کا عمل دخل ہر کام کے لئے مناسب نہیں ہے۔لہٰذا ایسے قانون بنانے کی ضرورت ہے جس کے تحت عدالتیں مفادِ عامہ کی درخواستیں منظور نہ کریں۔بات بات کے لئے مفاد عامہ کی درخواستیں منظور کرنے پر سیاست دانوں کے تبصرے پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عدالت نہیں! جسے دیکھئے مسئلوں کا پلندہ بغل میں دبائے اور مفادِ عامہ کی اپیل ہاتھ میں اٹھائے عدالت چلا آ رہا ہے۔ گویا عدالتیں نہ ہوئیں نوشیرواں اور جہانگیر بادشاہ کا دربار ہو گئیں کہ جو چاہے انصاف کی زنجیر کھینچ لے اور انصاف مانگ لے! میاں انصاف بھی کوئی بھیل پوری ہے کہ جس نے جب چاہا چوپاٹی پر جا کر بھوک مٹالی۔''

نصرت ظہیر نے طنز ومزاح کے پیرائے میں سیاست دانوں کے اس حربے کو بے نقاب کیا ہے جس کی بدولت عوام کو گمراہ کرتے ہیں اور ترقی کے راستے سے بھٹکا کر مذہبی جذبات، ذات پات اور اُونچ نیچ، دھرنے، مظاہرے کے بھنور میں ڈال کر ایفیجی کی سی حالت بنا دیتے ہیں اور انہیں اس لائق نہیں چھوڑتے کہ وہ ہندوستان کی، اپنی فیملی کی یا خود کی بہتری کے لئے سوچ سکیں۔سیاست دانوں پر طنز کا وار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میاں، یہ ہم ہیں، جو عوام کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں۔ یہ ہم ہیں جو انہیں سمجھاتے ہیں کہ بھیا جب تک

ایودھیا میں مندر نہیں بنے گا، تب تک ہندو کو آتم سمّان نہیں مل سکتا۔ جب تک پچھڑی ذات کو ریزرویشن نہیں ملے گا تب تک وہ عزت سے نہیں جی سکے گی۔ جب تک مسلم پرسنل لا کو محفوظ نہیں رکھا جائے گا تب تک مسلمانوں کے گھروں سے ٹاٹ کے پردے نہیں ہٹیں گے۔...اس کے علاوہ وہ ہم ہی ہیں جو انہیں دھرنے، مظاہرے، چکا جام، جلسہ، ووٹ اور الیکشن کے چکر میں الجھا کر دوسری تمام فکروں سے آزاد رکھتے ہیں۔انہیں اپنے ٹھنڈے چولھے کی پرواہ نہیں رہتی ہے، نہ بھوک اور غریبی کی، نہ انہیں بے روزگاری کا غم ستاتا ہے، نہ غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں دیش کی دولت لٹنے کا دکھ ہوتا ہے۔اگر ہم نہ ہوں تو یہ تمام دکھ انہیں پاگل کر دیں اور یہ لوگ مرنے مارنے پر اتر آئیں۔ چنانچہ یہ ہم ہی ہیں جو انہیں چین سے جینے اور مرنے میں مدد کرتے ہیں ورنہ یہ عدالتیں تو ان کا دماغ خراب کر کے رکھ دیں! آپ ہی بتائیے دیش میں کس کا عمل دخل ہونا چاہئے؟ ہم عوامی نمائندوں کا یا عدالت کا۔''

نصرت ظہیر کی متذکرہ عبارت میں کس قدر سچائی، عوام کے تئیں محبت کا جذبہ ہے اور عوام کی آنکھیں کھولنے کے لئے کس قدر طنز کے تیز دھار کا استعمال کیا ہے۔لگتا ہے کہ سیاست داں طبقہ عوام کا رہنما نہیں بلکہ ان کو تاریکی میں دھکیلنے والی کوئی جماعت ہے۔

ہندوستان میں چوبیسوں گھنٹے دکھائی جانے والے ٹی وی چینلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے مدّعوں کی کمی ہوگئی ہے۔اس لئے میڈیا والے معمولی سے معمولی واقعات کو بھی غیر معمولی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کچھ دنوں کی بات ہے جب فلم ''سلم ڈاگ ملینیئر'' کو آٹھ آسکر ایوارڈ ملے تھے جس کی دھوم پورے ہندوستان میں تھی۔میڈیا والوں نے بھی آسکر ایوارڈ کو ٹی وی چینلوں پر اس قدر اُچھالا کہ گندی بستیوں اور غریبی Concept اور مفہوم ہی بدل دیا۔گندی بستیوں میں جا جا کر وہاں کے رہنے والوں کا ایسے انٹرویو لینے لگے جیسے وہ راتوں رات سچ مچ کروڑ پتی بن گئے ہوں۔نصرت ظہیر نے میڈیا والوں کی اچھی طرح خبر لی اور اپنے کالم ''جے ہو غریبی کی'' میں انہیں اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔میڈیا والے ہر موقع پر ایک ہی طرح کے سوالات پوچھتے ہیں جو نہایت مضحکہ خیز ہوتے ہیں، جس کی منظر کشی نصرت ظہیر نے اس طرح کی ہے:

''چاچا آپ کا نام کیا ہے...گھ گھ گھ...گھسیٹا...سلم ڈاگ ملینیئر آسکر ملنے کے بعد کیسا لگ رہا ہے؟...آپ جانتے ہیں آسکر کیا ہوتا ہے؟...نہیں ہم نہیں جانتے...مگر اچھا ہے....بہت اچھا ہے...دیکھا ناظرین آپ نے، یہ شہر کی سب سے گندی بستی میں رہنے والا گھسیٹا، بالکل نہیں جانتا کہ آسکر کس چڑیا کا نام ہے، اس کے باوجود یہ خوش ہے، اسے فخر ہے اپنے دیش پر ناز ہے اپنے فلم سازوں کی صلاحیتوں پر ٹیکنیشین پر، موسیقاروں پر، گیت کاروں اور اداکاروں پر...کیوں ٹھیک ہے نہ گھسیٹا...نہیں نہیں... پتہ نہیں...لیکن اچھا ہے...سب اچھا ہے...یہ ڈنڈا بھی...بندوق بھی...سب اچھا ہے۔''

نصرت ظہیر نے گھسیٹا کے کردار میں ایک ایسے شخص کا انٹرویو دکھایا ہے جو مائکروفون کو ڈنڈا اور ویڈیو کیمرہ کو بندوق سمجھتا ہے اس سے آسکر ایوارڈ کے متعلق اس کے خیالات جاننے کی کوشش کرنا کس قدر مضحکہ خیز ہے اور پھر اس انٹرویو میں گھسیٹا کے خیالات کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہوئے یہ کہہ کر میڈیا پر بہت بڑا طنز کیا ہے کہ ''اسے فخر ہے اپنے دیش پر ناز ہے اپنے فلم سازوں کی صلاحیتوں پر ٹیکنیشین پر، موسیقاروں پر، گیت کاروں اور اداکاروں پر۔''

نصرت ظہیر نے آسکر ایوارڈ ملنے کے بعد گندی بستیوں اور ان بستیوں کے رہنے والوں پر فخر محسوس کرنے والوں پر بھی طنز کیا ہے کیوں کہ ایسے لوگ Fool's Paradise میں جیتے ہیں۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر یہ سرمایۂ افلاس اسی طرح آسکر دلاتا رہا تو شاید دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار بھی ہم ہی نکلیں، بھلے ہی وہ مفلسی کی سرمایہ داری کیوں نہ ہو۔تو آیئے عہد کرتے ہیں کہ ہم جھگی جھونپڑیوں اور گندی بستیوں کو خوب ترقی دیں گے، انہیں اور پھیلائیں گے، ان میں زندگی کو اور مشکل بنائیں گے اور ہر شہر میں کم سے کم ایک بڑی... بلکہ ہو سکے تو بہت بڑی اور گندی بستی ضرور بسائیں گے۔''

ان الفاظ میں غریبی کی بدولت ملنے والے آسکر ایوارڈ پر خوش ہونے والوں پر نصرت ظہیر نے تیکھا طنز کیا ہے۔انہوں نے اپنے عہد نامے میں بھی بلا کا طنز ومزاح پیدا کیا ہے۔

نصرت ظہیر نے سیاسی پارٹیوں کے سیاسی ہتھکنڈوں پر طنز کرتے ہوئے اپنے ایک کالم ''نئی نئی سیاست کا نیا قاعدہ'' میں بچوں کے لئے ایسے قاعدے تیار کرنے کی بات کی ہے جس میں حروف تہجی سکھانے کے لئے پھلوں یا اللہ کے ناموں کے استعمال کرنے کے بجائے سیاسی پارٹیوں کے ناموں کا استعمال کیا جائے مثلاً الف سے اللہ کے بجائے انا ڈی ایم کے یا اکالی کا استعمال کیا جائے۔اور جملوں میں استعمال کرنے لئے ان پارٹیوں سے دور رہنے کی بات کی گئی ہے۔اسی کالم میں سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے علاوہ خاص علاقوں میں رہنے والوں پر بھی طنز کیا ہے مثلاً یکم جون 2009 کے کالم میں لکھتے ہیں:

''وہ اکالی ہے۔یہ آدمی ہے۔اکالی سے مل۔انا ڈی ایم کے سے مت مل۔سرکار مت گرا۔آلو نہ بن۔آدمی بن۔آلو لے کر آ۔لالو کو آلو دے۔یہ آم کچّے ہیں۔عوام بچے ہیں۔آلو بخارا کھا۔...'ب' سے بی ایس پی۔'ب' سے بہن جی۔'ب' سے بی جے پی۔'ب' سے بال ٹھاکرے۔'ب' سے بم۔'ب' سے بہاری۔'ب' سے بے وقت کی راگنی۔''

ان جملوں میں انہوں نے جو سبق بنایا ہے اس سے تخریبی پارٹیوں پر طنز کرنے کے ساتھ ساتھ مایاوتی، بال ٹھاکرے اور لالو پر طنز کیا ہے۔ساتھ ہی لالو کی رعایت سے بہاریوں پر بھی طنز کیا ہے۔کئی دفعہ طنز اتنا باریک ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت کو سمجھنے میں قاری غلطی کر بیٹھتا ہے اور اسے ذاتی، ریسیل اور سماجی مدعا بنا دیتے ہیں جو بعد میں ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔مثلاً ہزاروں سال پہلے مہابھارت کی عظیم جنگ کے ہونے کی وجوہات میں ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ دروپدی نے دریودھن کو ''اندھے کا بیٹا اندھا'' کہہ کر اس پر طنز کیا اور اس کا مذاق اڑایا تھا۔حال ہی میں 27 مارچ 2009 کو ایچ کے میگزین میں کالم نگار Chip Tsao کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں چین اور فلی پائن کے درمیان متنازعہ خطہ ''Spratly islands'' کو لے کر چینی حکومت اور چینی وطن پرستوں کو چھیڑنے کے لئے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نے اپنے آپ کو ہانگ کانگ کا ایک وطن پرست ملازم ہونے کی بات چھپاتے ہوئے Spratly islands'' پر چین کی حاکمیت کو ظاہر کرنے کے لئے فلپائنی ملازمہ کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا اور اس کی بے حرمتی کی۔اس نے لکھا ہے:

"As a nation of servants, you don't flex your muscles at your master, from whom you earn most of your bread and butter."

Tsao نے اپنے مضمون میں ملازمہ کو سخت طریقے سے ڈانٹ پھٹکار لگائی یہاں تک کہ اسے ملازمت سے برخاست کرنے کی دھمکی بھی دی۔اس مضمون میں Tsao نے دراصل چینی وطن پرستوں پر طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اس طنز کو فلی پائینوں پر Racist attack سمجھا گیا اور اس مضمون کی چاروں طرف سے اس قدر مذمت ہوئی کہ اسے فوراً ویب سائٹ سے ہٹا دیا گیا اور HK میگزین نے بعد میں معذرت پیش کرتے ہوئے ایک بیان جاری

کر کے بتایا کہ یہ محض ایک طنز تھا اس کا مقصد کسی قوم کی دل آزاری نہیں تھا۔

نصرت ظہیر کے طنز کا مقصد بھی کسی کی شخصیت یا کسی قوم یا کسی خاص خطہ میں رہنے والوں کا دل دکھانا نہیں ہے بلکہ یہ صرف طنز و مزاح ہے۔ بہر حال طنز و مزاح کا یہ کمال ہے کہ جس شخص یا قوم یا کسی خاص خطہ کے رہنے والوں پر طنز کیا جاتا ہے تو اسے صحیح سمجھنے کے بعد قاری کے ذہن میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی ہے وہ چاہ کر بھی React نہیں ہوتا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں Reaction موجزن رہتے ہیں اور جب اسے ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں جاتا ہے تو قاری کا ردّ عمل احتجاج اور غصّے کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ طنز قاری کے اندر ایک عجیب و غریب کشیدگی پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے تمام اصناف میں اس کو فوقیت حاصل ہے۔ سنسکرت کے اچاریوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ ادب، ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہے جس میں طنز کا عنصر نہ ہو۔ سنسکرت کے اچاریہ ممٹ نے کہا ہے کہ:

> اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طنز کے ذریعہ سماج پر مصنف کا لطیف ضرب قاری کے مطالعاتی تجربے کو کارآمد اور مفید بناتا ہے۔

نصرت ظہیر کی تحریروں میں طنز و مزاح کی تمام تر خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے کالم پڑھنے کے بعد طنز کے متعلق سنسکرت اچاریوں کا متذکرہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ نصرت ظہیر اسی طرح آب و تاب کے ساتھ لکھتے رہے تو طنز و مزاح کا یہ فن مزید ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا اور ان کے کالم سے قوموں کی زندگی میں تلاطم بھی پیدا ہوتا رہے گا۔

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad